ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1956

Program: BS Islamic Studies (Spec. Qur'an & Tafsir)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس :تاریخِ تفسیر • (1956) سطح :بی ایس علومِ اسلامیہ) تخصص قرآن و تفسیر(

سمسٹر :خزاں2026

امتحانی شق نمبر) 1 یونٹ نمبر 1 :تا(5

کل نمبر • 100 :کامیابی کے نمبر50 :

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

)مطالعہ و حوالہ کے لیے(

نوٹ :یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس کا مطالعہ کریں، مفاہیم کو اچھی طرح سمجھیں اور جوابات اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

سوال نمبر :1 عہدِ نبوی میں تفسیر کا ارتقا 20) نمبر(

سوال نمبر1 ۔ عہدِ نبوی میں تفسیر کے ارتقا پر روشنی ڈالیے۔

تعارف

تفسیر کا لغوی معنی ہے کھولنا، بیان کرنا اور کسی پوشیدہ بات کو واضح کرنا، اور اصطلاح میں تفسیر سے مراد قرآن مجید کی آیات کے معانی و مفاہیم، ان کے شانِ نزول، ناسخ و منسوخ اور احکام و مقاصد کی وہ وضاحت ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی مراد معلوم ہو۔ تاریخِ تفسیر کا مطالعہ دراصل اس سوال کا جواب ہے کہ قرآن فہمی کا یہ عظیم فن کن مراحل سے گزر کر موجودہ صورت تک پہنچا۔ اس فن کا نقطۂ آغاز خود وحی کے نزول کے ساتھ ہو جاتا ہے، کیونکہ قرآن مجید کے سب سے پہلے اور سب سے معتبر مفسر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ عہدِ نبوی میں تفسیر کسی باقاعدہ تدوین شدہ فن کی صورت میں موجود نہ تھی، بلکہ وہ وحی کی تنزیل کے ساتھ ساتھ جاری ایک زندہ تعلیمی عمل تھی۔ اس جواب میں ہم عہدِ نبوی میں تفسیر کی حیثیت، اس کے ذرائع و صورتوں، صحابہ کرام کی تعلیم کے نظام اور

اس عہد کی نمایاں خصوصیات کا جائزہ لیں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ بعد کے تمام تفسیری ادوار کی بنیاد اسی مبارک عہد میں رکھی گئی تھی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بطور اولین مفسر

قرآن مجید نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داریوں میں آیات کی تبلیغ کے ساتھ ان کی تبیین و تشریح کو بھی شامل کیا ہے۔ سورۃ النحل میں ارشاد ہے کہ ہم نے آپ کی طرف ذکر (قرآن) نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے لیے اس چیز کو کھول کر بیان کر دیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔ اسی طرح سورۃ آل عمران اور سورۃ الجمعہ میں رسول کی بعثت کے مقاصد میں کتاب کی تعلیم کو حکمت کی تعلیم کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر نبوت کے فرائض میں شامل ایک باقاعدہ منصبی فریضہ تھی، اتفاقی یا انفرادی عمل نہیں تھا۔ اسی لیے علماء نے متفقہ طور پر یہ اصول تسلیم کیا ہے کہ تفسیر کی سب سے اعلیٰ اور قطعی صورت وہ ہے جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو، اور اسے تفسیر بالماثور کا سب سے معتبر درجہ قرار دیا گیا ہے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر کی صورتیں متنوع تھیں۔ کبھی آپ کسی آیت کے مجمل مفہوم کو ایک عملی حکم کی صورت میں کھول دیتے، جیسے نماز، زکاۃ اور حج کے اجمالی احکام کی تفصیل آپ کے اقوال و افعال سے ملی۔ کبھی کسی صحابی کے سوال کے جواب میں آیت کی وضاحت فرماتے، جیسے سورۃ الانعام کی آیت میں ظلم سے مراد شرک بتایا جب صحابہ نے اس سے گناہ سمجھا۔ کبھی آپ قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے فرماتے، جیسے سورۃ الفاتحہ میں مغضوب علیہم اور ضالین کی تعیین دیگر آیات کی روشنی میں کی گئی۔ آپ کی سیرت اور عملی زندگی بذاتِ خود قرآن کا عملی نمونہ تھی، اسی لیے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ آپ کا اخلاق قرآن تھا۔ یوں قول، فعل اور تقریر، تینوں صورتیں تفسیرِ نبوی کے ذرائع بنے۔

صحابہ کرام کی تعلیم کا نظام

عہدِ نبوی میں قرآن فہمی کی تعلیم کا مرکز مسجدِ نبوی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آیات نازل ہونے پر صحابہ کو سناتے، ان کی کتابت کاتبانِ وحی سے کرواتے اور مشکل الفاظ و مفاہیم کی وضاحت فرماتے۔ اصحابِ صفہ کا ادارہ اس تعلیمی نظام کی بہترین مثال ہے جہاں مقیم صحابہ دن رات قرآن و سنت کی تعلیم میں مصروف رہتے تھے۔ آپ نے مختلف

علاقوں میں معلمین بھی روانہ فرمائے؛ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مدینہ بھیجے گئے اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا معلم و قاضی بنا کر بھیجا گیا، جہاں انہوں نے قرآن کی تعلیم و تفسیر کی خدمت انجام دی۔ اس نظام کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ صحابہ صرف الفاظ نہیں سیکھتے تھے بلکہ دس آیات سیکھ کر ان کے علم و عمل کو اختیار کیے بغیر آگے نہیں بڑھتے تھے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہے۔

اسی تعلیمی ماحول میں صحابہ کی ایک جماعت تفسیر میں خصوصی شہرت کی حامل قرار پائی۔ ان میں خلفائے راشدین خصوصاً حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم کے نام نمایاں ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے خصوصی دعا فرمائی کہ اے اللہ !اسے دین کی سمجھ عطا فرما اور تاویل) تفسیر (کا علم سکھا۔ یہی دعا بعد میں ابن عباس کو ترجمان القرآن کے عظیم مرتبے تک لے گئی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ تفسیر کا فن عہدِ نبوی ہی میں ایک باقاعدہ ذوق و اختصاص کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

مکی و مدنی دور میں تفسیر کی نوعیت

عہدِ نبوی کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر کی نوعیت بھی نزول کے مراحل کے مطابق بدلتی رہی۔ مکی دور میں قرآن کا بڑا حصہ عقائد، توحید، رسالت، آخرت اور اخلاقی تربیت پر مشتمل تھا، اس لیے تفسیر کی ضرورت زیادہ تر الفاظ کے لغوی مفاہیم، مشرکین کے اعتراضات کے جوابات اور سابقہ امتوں کے قصص کی وضاحت کی صورت میں پیش آتی تھی۔ اس دور میں مخاطب عرب تھے جو خالص عربی زبان کے ماہر تھے، اس لیے لفظی مشکلات کم تھیں اور مفہوم کی گہرائی عمل و عقیدے کی اصلاح میں ظاہر ہوتی تھی۔

مدنی دور میں جب اسلامی ریاست قائم ہوئی اور عبادات، معاملات، خاندانی زندگی، جہاد اور اہل کتاب سے تعلقات کے احکام نازل ہوئے تو تفسیر کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ اب اجمالی احکام کی تفصیل، ناسخ و منسوخ کی معرفت، اسبابِ نزول کی شناخت اور وقائع سے آیات کے تعلق کو سمجھنا ضروری ہو گیا۔ مدینہ میں یہود سے واسطہ پڑنے پر بعض اہل کتاب سے متعلق آیات کی وضاحت بھی درکار ہوئی۔ تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسرائیلی روایات کے بارے میں محتاط

رویہ سکھایا کہ اہل کتاب کی خبر نہ تصدیق کرو نہ تکذیب۔ یوں مدنی دور میں تفسیر نے فقہی و تشریعی وسعت اختیار کی اور یہی وسعت آگے چل کر تفسیر کے فقہی، کلامی اور لغوی دھاروں کی بنیاد بنی۔

عہدِ نبوی میں تفسیر کی خصوصیات

اس عہد کی تفسیر کی پہلی خصوصیت اس کا ماثور و منقول ہونا ہے؛ جو کچھ بیان ہوتا تھا وہ وحی یا وحی کی تربیت یافتہ سمجھ پر مبنی ہوتا تھا، شخصی رائے کو اس میں دخل نہ تھا۔ دوسری خصوصیت اجمال و اختصار ہے؛ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف اسی قدر وضاحت فرماتے جس کی عملی ضرورت ہوتی، غیر ضروری تفصیلات اور فلسفیانہ مباحث سے اجتناب تھا۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس دور میں تمام قرآن کی تفسیر الگ الگ آیات کی صورت میں بیان کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی، کیونکہ صحابہ خود عینی شاہد تھے اور نزول کے حالات ان کے سامنے تھے۔ چوتھی خصوصیت عملیت ہے؛ تفسیر کا مقصد علمی تفریح نہیں بلکہ ہدایت و عمل تھا۔ پانچویں نمایاں بات یہ ہے کہ اس عہد میں تفسیر تدوین و تصنیف کی صورت میں نہیں بلکہ سماع، حفظ اور زبانی روایت کی صورت میں محفوظ رہی، جس نے آگے چل کر روایت و اسناد کے عظیم نظام کی بنیاد رکھی۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ عہدِ نبوی تفسیر کا عہدِ تاسیس ہے۔ اس دور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تبیین کا فریضہ قولاً، فعلاً اور تقریراً ادا فرمایا، صحابہ کرام کی ایک تربیت یافتہ جماعت تیار ہوئی اور مسجد و صفہ کے تعلیمی نظام نے قرآن فہمی کو ایک زندہ روایت کی صورت دے دی۔ اگرچہ اس عہد میں تفسیر باقاعدہ کتب کی صورت میں مدون نہ تھی، مگر اس کے اصول، اس کے مصادر اور اس کے امین حاملین سب اسی عہد کی دین ہیں۔ بعد میں آنے والے ہر دور کی تفسیر اسی بنیاد پر کھڑی ہے؛ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ عہدِ نبوی کو سمجھے بغیر تاریخِ تفسیر کا کوئی بھی مرحلہ درست طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔

سوال نمبر :2 تابعین کے دور میں تفسیر کا ارتقا اور مکہ مکرمہ کے تفسیری مدارس (20 نمبر)

سوال نمبر2 ۔ تابعینؒ کے دور میں تفسیر کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے مکہ مکرمہ کے تفسیری مدارس پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

تعارف

تابعین وہ مبارک نسل ہے جس نے صحابہ کرام سے فیض پایا اور قرآن و سنت کے علم کو اگلی نسل تک پہنچایا۔ عہدِ تابعین تقریباً پہلی صدی ہجری کے وسط سے دوسری صدی ہجری کے آغاز تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور میں اسلامی سلطنت عرب سے نکل کر روم و فارس کے وسیع علاقوں تک پھیل چکی تھی، غیر عرب اقوام بڑی تعداد میں دائرہ اسلام میں داخل ہو رہی تھیں اور علمی مراکز صرف مدینہ تک محدود نہیں رہے تھے بلکہ مکہ، کوفہ، بصرہ، شام، یمن اور مصر میں علم کے حلقے قائم ہو چکے تھے۔ ان حالات نے تفسیر کے فن کو ایک نیا موڑ دیا اور تفسیر محض روایت نہیں رہی بلکہ علاقائی مدارس (اسکولز) کی صورت میں منظم علمی روایت بن گئی۔ اس جواب میں پہلے تابعین کے دور میں تفسیر کے عمومی ارتقا کا جائزہ لیا جائے گا اور پھر مکہ مکرمہ کے تفسیری مدرسے پر تفصیلی نوٹ پیش کیا جائے گا۔

تابعین کے دور میں تفسیر کا عمومی ارتقا

اس دور کا پہلا بڑا ارتقائی قدم تفسیر کی جغرافیائی وسعت ہے۔ صحابہ کرام جب مختلف شہروں میں آباد ہوئے تو وہ اپنے ساتھ اپنے مخصوص تفسیری اثرات لے کر گئے۔ ہر شہر میں کسی نہ کسی جلیل القدر صحابی کے گرد تابعین کا حلقہ قائم ہو گیا اور یوں ایک ہی علمی ورثے کی مختلف مقامی شاخیں وجود میں آ گئیں۔ دوسرا قدم یہ ہے کہ تفسیر میں اجتہاد و رائے کا عنصر باقاعدہ شامل ہوا۔ صحابہ کے براہِ راست شاگرد ہونے کے باوجود تابعین نے لغت، اشعارِ عرب اور سیاق و سباق سے استدلال کر کے آیات کی تشریح کی، کیونکہ اب سوال کرنے والے وہ نئے مسلمان بھی تھے جنہوں نے نزول کا ماحول نہیں دیکھا تھا۔

تیسرا اہم پہلو اسرائیلیات کے محدود ورود کا ہے۔ اس دور میں وہب بن منبہ اور دیگر اہل کتاب سے منسلک راویوں کے ذریعے سابقہ امتوں کے قصص کی تفصیلات تفسیر میں داخل ہونے لگیں۔ اہل علم تابعین نے ان کے ساتھ وہی محتاط رویہ رکھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا تھا، لیکن بہرحال اسبابِ نزول اور قصص کی تفصیلات کی طلب نے روایتی مواد میں وسعت پیدا کر دی۔ چوتھا پہلو یہ ہے کہ اس دور کے اواخر میں تفسیر کی تدوین کا آغاز ہوا؛ اب تک زبانی روایت پر انحصار تھا، مگر پھر صحیفوں اور اجزاء کی صورت میں تفسیری روایات قلمبند ہونے لگیں، جن میں حضرت مجاہد کی تفسیر کی روایت خاص شہرت رکھتی ہے۔ ان سب عوامل نے تفسیر کو روایت کے دور سے نکل کر فن کی تدوین کے دور کی طرف گامزن کر دیا۔

تفسیری مدارس کا قیام

تابعین کے دور میں پانچ بڑے تفسیری مدارس قائم ہوئے۔ مدرسۂ مدینہ کی بنیاد حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کے فیض پر تھی اور اس کے نمایاں اساتذہ میں ابو العالیہ، محمد بن کعب القرظی اور زید بن اسلم شامل ہیں۔ مدرسۂ کوفہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی تعلیمات سے پھلا پھولا، جہاں علقمہ، اسود، مسروق اور ابراہیم نخعی جیسی شخصیات پیدا ہوئیں اور یہ مدرسہ رائے و قیاس میں نسبتاً آگے تھا۔ مدرسۂ بصرہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے زیر اثر قائم ہوا، جہاں حسن بصری اور قتادہ جیسے مفسرین ہوئے۔ مدرسۂ شام میں کعب الاحبار کی روایات کا اثر نمایاں رہا اور مدرسۂ یمن میں وہب بن منبہ کا حلقہ مشہور ہوا۔ ان تمام مدارس میں سب سے زیادہ علمی وقار اور تفسیر بالماثور کی مضبوط روایت مدرسۂ مکہ کو حاصل ہوا، جس کی تفصیل آئندہ سطور میں پیش کی جاتی ہے۔

مدرسۂ مکہ :قیام اور مرکزی شخصیت

مدرسۂ مکہ کے بانی اور مرکزی استاد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں، جنہیں حبر الامہ اور ترجمان القرآن کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائے تاویل کے صدقے انہیں قرآن فہمی میں وہ امتیاز حاصل ہوا کہ بڑے بڑے صحابہ بھی مشکل آیات میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں اپنے مشورے کی مجلس میں شامل کرتے اور اہل بدر کے سامنے ان سے آیات کی تفسیر پوچھتے تھے۔ ابن عباس نے مکہ مکرمہ

میں حرم کی فضا میں تفسیر کا مستقل حلقہ قائم کیا، جہاں قرآن پڑھایا جاتا، غریب الفاظ کی تشریح ہوتی، ناسخ و منسوخ بیان ہوتا اور اشعارِ عرب سے استشہاد کے ذریعے معانی کی تائید پیش کی جاتی۔

ابن عباس کی تفسیری خصوصیات میں چند امور بنیادی ہیں۔ اول یہ کہ وہ قرآن کی تفسیر قرآن، سنت اور اقوال صحابہ سے کرتے، پھر عرب کے کلام اور شعر سے مدد لیتے۔ دوم یہ کہ انہوں نے غریب القرآن کی تشریح کو باقاعدہ فن کی صورت دی؛ ان سے مروی مسائل نافع بن الازرق کے جوابات اس کی روشن مثال ہیں، جن میں انہوں نے مشکل الفاظ کے معانی قدیم عربی شعر کے شواہد سے ثابت کیے۔ سوم یہ کہ انہوں نے اسرائیلیات کے سلسلے میں محتاط انداز اپنایا اور صرف اسی قدر لیا جو قرآن و سنت سے متصادم نہ ہو۔ انہی اوصاف کی بنا پر علماء نے متفقہ فیصلہ دیا کہ تابعین میں تفسیر کا سب سے بڑا مدرسہ ابن عباس ہی کا مدرسہ ہے۔

ابن عباس کے تلامذہ اور مدرسے کی روایت

مدرسۂ مکہ کی علمی روایت ابن عباس کے تلامذہ کے ذریعے آگے بڑھی۔ ان میں سرِ فہرست حضرت مجاہد بن جبر ہیں جنہوں نے قرآن مجید تیس مرتبہ ابن عباس کے سامنے پڑھا اور ہر آیت پر رک کر اس کی تفسیر پوچھی؛ ان کی تفسیر کو امام شافعی اور امام بخاری جیسے ائمہ نے قابل اعتماد قرار دیا۔ حضرت سعید بن جبیر کو ابن عباس کے شاگردوں میں سب سے بڑا عالم مانا جاتا ہے۔ حضرت عکرمہ، جو ابن عباس کے آزاد کردہ غلام تھے، تفسیر کے نقل و اشاعت میں غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں اور ان سے روایات کی کثرت مروی ہے۔ حضرت طاؤس بن کیسان یمانی اور حضرت عطاء بن ابی رباح بھی اسی حلقے کے درخشندہ ستارے ہیں؛ عطاء کو اہل مکہ کا سب سے بڑا فقیہ و مفتی تسلیم کیا گیا۔ ان اساتذہ نے مکہ کو آنے والے حاجیوں اور طالب علموں کے لیے تفسیر کا بین الاقوامی مرکز بنا دیا، کیونکہ موسم حج میں دنیا بھر کے طلبہ یہاں جمع ہوتے اور یہ علم اپنے علاقوں تک لے جاتے۔

مدرسۂ مکہ کی امتیازی خصوصیات

مدرسۂ مکہ کی پہلی خصوصیت تفسیر بالماثور پر پختہ اعتماد ہے؛ یہاں رائے کو نقل کے تابع رکھا گیا۔ دوسری خصوصیت لغوی تحقیق ہے؛ الفاظ کے معانی کے لیے اہل عرب کے قدیم کلام اور شعر کو معیار بنایا گیا، جس نے آگے چل کر لغوی تفسیر کی بنیاد رکھی۔ تیسری خصوصیت اسناد کی نسبتاً مضبوطی ہے، کیونکہ اس مدرسے کی روایات کا سلسلہ

ابن عباس تک مختصر اور واضح ہے، اسی لیے امام ابن تیمیہ سمیت متعدد محققین نے مکہ کے مفسرین کی روایات کو سب سے اصح قرار دیا۔ چوتھی خصوصیت توازن ہے؛ نہ یہاں کوفہ جیسی وسعتِ رائے تھی نہ قصص و اسرائیلیات کی بے احتیاطی۔ یہی توازن اس مدرسے کی پہچان بنا اور بعد کے مفسرین، خصوصاً امام طبری، نے اپنی جامع تفسیر میں مکہ کی روایات کو نمایاں جگہ دی۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ تابعین کا دور تفسیر کی تنظیم و تدوین کا دور ہے، جس میں تفسیر مدینے کے حلقے سے نکل کر پوری اسلامی دنیا کے مدارس میں پھیل گئی۔ ان مدارس میں مدرسۂ مکہ کو ابن عباس کی علمی عظمت، ان کے جلیل القدر تلامذہ، لغوی تحقیق کے اسلوب اور ماثور روایت کی پختگی کی بدولت سب سے ممتاز مقام حاصل ہوا۔ اسی مدرسے نے تفسیر کو وہ معیار عطا کیا جس پر بعد کے تمام مفسرین نے اپنے کام کی بنیاد رکھی، اور تاریخِ تفسیر میں اس کا نام ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔

سوال نمبر :3 تبع تابعین کے دور کی مشکلات اور اس عہد کا اسلوب و خصوصیاتِ تفسیر 20) نمبر(

سوال نمبر3 ۔ تبع تابعینؒ کے دور کی مشکلات ذکر کیجیے اور اس عہد کا اسلوب و خصوصیاتِ تفسیر لکھیے۔

تعارف

تبع تابعین سے مراد وہ نسل ہے جس نے تابعین سے علم حاصل کیا۔ ان کا دور تقریباً دوسری صدی ہجری سے تیسری صدی ہجری کے وسط تک محیط ہے۔ یہ دور اسلامی علوم کی تدوین کا عہدِ زریں ہے؛ حدیث، فقہ، لغت اور تاریخ کی طرح تفسیر بھی اسی دور میں باقاعدہ کتب کی صورت میں مدون ہوئی۔ لیکن یہ دور آسانیوں کے ساتھ ساتھ بڑی فکری و علمی مشکلات کا دور بھی تھا۔ ایک طرف اسلامی معاشرہ مختلف فتنوں اور فرقوں کی آماجگاہ بن رہا تھا، دوسری طرف غیر عرب مسلمانوں کی اکثریت ہو جانے سے زبان و فہم کے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ اس جواب میں پہلے اس دور کی اہم

مشکلات کا ذکر کیا جائے گا اور پھر اس عہد کے تفسیری اسلوب اور خصوصیات کو بیان کیا جائے گا تاکہ اس مرحلے کی مکمل تصویر سامنے آ سکے۔

پہلی مشکل :اسرائیلی روایات کا وسیع نفوذ

عہدِ تبع تابعین کی سب سے نمایاں مسکل اسرائیلیات کا بڑے پیمانے پر تفسیر میں داخل ہونا تھا۔ تابعین کے دور میں یہ روایات محدود اور محتاط انداز میں آئیں، لیکن اس دور میں قصص گو واعظوں اور غیر محتاط راویوں کے ذریعے سابقہ امتوں کے واقعات کی بے شمار تفصیلات تفسیر کا حصہ بن گئیں۔ کعب الاحبار اور وہب بن منبہ سے منقول مواد بغیر تحقیق آگے منتقل ہونے لگا؛ اصحاب کہف کے کتے کا نام و رنگ، حضرت آدم علیہ السلام کے قامت کی لمبائی اور اس قسم کی غیر ضروری جزئیات تفسیری کتب میں جگہ پانے لگیں۔ ان روایات میں سے بہت سی قرآن و سنت کی نصوص سے ٹکراتی تھیں یا عقل کے خلاف تھیں۔ اس کیفیت نے اہل علم کے سامنے تنقید و تحقیق کا بڑا چیلنج کھڑا کر دیا اور بعد میں محدثین و مفسرین کو روایات کی چھان بین کا پورا فن وضع کرنا پڑا۔

دوسری مشکل :وضعِ حدیث اور فرقہ وارانہ رجحانات

اس دور میں سیاسی و مذہبی اختلافات نے وضع حدیث کی وبا کو جنم دیا۔ مختلف فرقے اپنے موقف کی تائید کے لیے آیات کی من مانی تاویلیں اور جعلی روایات گھڑنے لگے۔ خوارج نے اپنے عقائد کے مطابق آیات کی تفسیر کی، معتزلہ نے عقل کو نقل پر مقدم کر کے متشابہات کی دور از کار تاویلیں شروع کیں، بعض غالی گروہوں نے ائمہ کی شان میں آیات کے باطنی معانی اختراع کیے اور قصاص نے مجالس کو رلانے کے لیے موضوع قصے تفسیر میں شامل کر دیے۔ اس صورت حال میں مفسر کے لیے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ روایت کے انبار میں صحیح و سقیم کی تمیز کرے۔ اسی چیلنج کے جواب میں اسناد کی جانچ، جرح و تعدیل اور رجال کے علم نے ترقی پائی، مگر بہرحال اس دور کی بہت سی تفسیری کتب میں ضعیف و موضوع روایات جگہ پا گئیں جن کی نشاندہی بعد کے محققین کرتے رہے۔

تیسری مشکل :لغوی مسائل اور تفسیر بالرائے کا تنازع

اسلام عرب سے باہر پھیل چکا تھا اور مسلمانوں کی غالب اکثریت عجمی النسل ہو چکی تھی۔ اب خود بہت سے پڑھے لکھے مسلمانوں کے لیے بھی قرآن کے غریب الفاظ اور محاورات سمجھنا دشوار ہو گیا تھا، چہ جائیکہ وہ خود تفسیر کی

اہلیت رکھتے۔ اسی ضرورت نے لغوی و نحوی تفسیر کو جنم دیا، لیکن اس کے ساتھ نحوی اختلافات اور قراءتوں کے اختلافات نے بھی تفسیری اختلافات کا دروازہ کھول دیا۔ دوسری طرف جب روایات میں آیت کی تفسیر نہ ملتی تو بعض اہل علم اپنی رائے سے تشریح کرنے لگے؛ یوں تفسیر بالرائے کی مذموم و محمود اقسام پر بحث شروع ہوئی۔ مذموم رائے، جو خواہش و تعصب پر مبنی ہو، اس دور کی بڑی آزمائش تھی، جبکہ محمود رائے یعنی علوم شرعیہ و لغویہ کی بنیاد پر اجتہاد ایک علمی ضرورت تھی۔ ان دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کرنا اس عہد کے علماء کا مستقل موضوع رہا۔

اس عہد کا اسلوبِ تفسیر

مشکلات کے باوجود اس عہد کا اسلوبِ تفسیر نہایت اہم اور تاریخ ساز ہے۔ اس کی پہلی جھلک تدوین ہے :اس دور میں پہلی مرتبہ پوری قرآن یا اس کے بڑے حصوں کی مستقل تفسیریں لکھی گئیں۔ مقاتل بن سلیمان کی تفسیر کو اولین مکمل تفاسیر میں شمار کیا جاتا ہے۔ سفیان ثوری، وکیع بن الجراح، شعبہ بن الحجاج اور عبدالرزاق صنعانی نے حدیثی طرز پر اسناد کے ساتھ تفسیری روایات کو جمع کیا۔ دوسری جھلک لغوی اسلوب کی ہے :ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ نے مجاز القرآن لکھ کر الفاظ و اسالیب کی لغوی تشریح کا دروازہ کھولا، فرّاء نے معانی القرآن میں نحوی تجزیے کو بنیاد بنایا اور ابو عبید قاسم بن سلام نے غریب القرآن پر کام کیا۔ تیسری جھلک فقہی میلان ہے، جس کی تفصیل آئندہ سوالات میں آرہی ہے کہ ائمہ فقہ کے شاگردوں نے آیات الاحکام کی طرف خصوصی توجہ دی۔

اس عہد کی خصوصیاتِ تفسیر

اس عہد کی خصوصیات کو چند نکات میں سمٹا جا سکتا ہے۔ اول :تفسیر حدیث سے الگ ایک مستقل فن بن گئی، اگرچہ ابتدائی مدون تفسیریں حدیثی مجموعوں ہی کے ابواب کے طور پر لکھی گئیں۔ دوم :روایات کو اسناد کے ساتھ نقل کرنے کا رواج عام ہوا، جس سے بعد میں امام ابن جریر طبری جیسے محققین کے لیے جامع تفسیری ذخیرہ میسر آ گیا۔ سوم :تفسیر کے تنوع کا آغاز ہوا؛ اب تفسیر بالماثور کے ساتھ لغوی، نحوی اور فقہی تفسیریں بھی سامنے آنے لگیں اور ہر مکتب فکر نے اپنا رنگ نمایاں کرنا شروع کیا۔ چہارم :ناسخ و منسوخ، اسباب نزول اور قراءات جیسے ذیلی علوم کی مستقل تدوین بھی اسی دور میں ہوئی، جس سے تفسیر کا ڈھانچہ وسیع اور منظم ہو گیا۔ پنجم یہ کہ اس دور میں

تفسیر پر علمی نقد کا آغاز بھی ہوا؛ محدثین نے راویوں کی جانچ شروع کر دی تھی جس کا اثر تفسیری روایات پر بھی پڑا۔

نتیجہ

حاصل کلام یہ ہے کہ تبع تابعین کا دور تفسیر کی تاریخ میں سرحدی نوعیت رکھتا ہے :ایک طرف یہ دور اسرائیلیات کے نفوذ، وضع روایات، فرقہ وارانہ تاویلات اور لغوی پیچیدگیوں جیسی سنگین مشکلات سے دوچار تھا، اور دوسری طرف یہی وہ دور ہے جس میں تفسیر نے تدوین، تنوع اور تخصص کی صورت اختیار کی۔ اس دور کے علماء نے مشکلات کا جواب علوم کی تدوین سے دیا، اور یہی ذخیرہ آنے والی صدیوں کی عظیم تفاسیر کی بنیاد بنا۔ اس لیے اس عہد کو مشکلات و امکانات دونوں کے حوالے سے تاریخِ تفسیر کا فیصلہ کن موڑ قرار دیا جاتا ہے۔

سوال نمبر :4 امام ابو بکر جصاص اور تفسیر احکام القرآن :اسلوب و خصوصیات (20 نمبر)

سوال نمبر4 ۔ امام ابو بکر جصاص رحمہ اللہ کا تعارف بیان کرتے ہوئے تفسیر" احکام القرآن "میں ان کا اسلوب اور اس کی خصوصیات قلمبند کیجیے۔

تعارف

تفسیر کی تاریخ میں جب فقہی تفسیر یعنی آیات الاحکام کی تشریح کا ذکر آتا ہے تو سب سے قدیم اور سب سے جامع کارناموں میں امام ابو بکر جصاص رحمہ اللہ کی احکام القرآن سر فہرست نظر آتی ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی یہ کتاب اس بات کی دلیل ہے کہ تبع تابعین کے بعد کے عہد میں فقہ و تفسیر کس قدر پختگی اختیار کر چکے تھے۔ اس جواب میں پہلے امام جصاص کا مختصر تعارف پیش کیا جائے گا، پھر ان کی کتاب کا تعارف، اس کا اسلوب اور اس کی امتیازی خصوصیات بیان کی جائیں گی۔

امام جصاص کا تعارف

امام جصاص کا پورا نام احمد بن علی ہے، کنیت ابو بکر اور لقب جصاص ہے، جس کی وجہ تسمیہ یہ مشہور ہے کہ آپ چونے) جص (کے کاروبار سے وابستہ تھے یا اسی پیشے سے شہرت پائی۔ آپ کی نسبت رے شہر کی طرف کی جاتی ہے، اسی لیے آپ کو رازی بھی کہا جاتا ہے۔ آپ کی ولادت305 ھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آپ بغداد تشریف لے گئے جو اس وقت علم و فن کا مرکز تھا۔ آپ کے سب سے ممتاز استاد امام ابو الحسن کرخی رحمہ اللہ ہیں جو حنفی فقہ و اصول کے امام تھے؛ آپ نے انہی سے فقہ و اصول کی تکمیل کی اور ان کی وفات پر ان کے علمی وارث قرار پائے۔ استاد کے انتقال کے بعد آپ نے بغداد ہی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور جلد ہی فقہ حنفی کے سربراہ کی حیثیت سے آپ کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔

امام جصاص کی تصانیف میں سے ہر ایک اپنے فن میں مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔ اصول فقہ میں آپ کی کتاب الفصول فی الاصول، جو اصول الجصاص کے نام سے مشہور ہے، حنفی اصول کی بنیادی کتب میں شمار ہوتی ہے۔ فقہ میں شرح مختصر الطحاوی اور شرح الجامع الصغیر آپ کے اہم علمی کارنامے ہیں۔ لیکن آپ کی شہرت کا سب سے بڑا سبب آپ کی تفسیری تصنیف احکام القرآن ہے جس نے آپ کو مفسرین کی صف میں بھی بلند مقام عطا کیا۔ آپ کی وفات370 ھ میں بغداد میں ہوئی۔ انصاف، دیانت اور علمی گہرائی آپ کی سیرت کے نمایاں اوصاف بیان کیے جاتے ہیں۔

کتاب احکام القرآن کا تعارف

احکام القرآن میں امام جصاص نے پورے قرآن کی تفسیر پیش نہیں کی بلکہ صرف ان آیات کو موضوع بنایا ہے جن سے شرعی احکام مستنبط ہوتے ہیں۔ کتاب کی ترتیب عین مصحف کی ترتیب کے مطابق ہے؛ مفسر سورہ بہ سورہ آگے بڑھتا ہے اور جہاں کوئی آیت الاحکام آتی ہے وہاں ٹھہر کر اس کی مکمل فقہی بحث پیش کرتا ہے۔ کتاب متعدد جلدوں میں طبع شدہ ہے اور فقہ حنفی کے ادب میں آیات الاحکام پر سب سے مفصل و ضخیم قدیم ماخذ تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعد کے بڑے مفسرین، خصوصاً امام قرطبی نے اپنی جامع تفسیر میں جصاص سے بھرپور استفادہ کیا اور ان کے اقوال و دلائل کو نقل کیا۔ یوں یہ کتاب اہل سنت کے فقہی تفسیری ذخیرے کی بنیادی اینٹ قرار پاتی ہے۔

امام جصاص کا اسلوبِ تفسیر

امام جصاص کا اسلوب علمی، استدلالی اور منظم ہے۔ وہ پہلے آیت کو ذکر کرتے ہیں، پھر اس کے الفاظ کی لغوی و اصطلاحی وضاحت کرتے ہیں تاکہ حکم کی بنیاد واضح ہو جائے۔ اس کے بعد وہ آیت سے مستنبط ہونے والے مسائل کو ایک ایک کر کے بیان کرتے ہیں اور ہر مسئلے میں فقہاء کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ ان کا اصل کمال استدلال میں ظاہر ہوتا ہے : وہ فقہ حنفی کے موقف کو قرآن کی نصوص، سنت، اقوال صحابہ و تابعین اور اصول و قیاس سے ثابت کرتے ہیں، مخالفین کے دلائل کو انصاف کے ساتھ پیش کرتے ان کا مدلل جواب دیتے ہیں، اور خود فقہ حنفی کے بزرگوں، امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کے درمیان اختلاف ہو تو اسے بھی واضح کرتے ہیں۔ اسلوب میں اصول فقہ کی جھلک نمایاں ہے؛ عام و خاص، مطلق و مقید، مجمل و مبین اور ناسخ و منسوخ کی بحثیں ان کی تفسیر کی جان ہیں۔

احکام القرآن کی خصوصیات

اس کتاب کی پہلی خصوصیت اس کا جامع فقہی استدلال ہے؛ آیات الاحکام پر اتنی مفصل بحث اس سے قبل کی کسی کتاب میں نہیں ملتی۔ دوسری خصوصیت توازن و انصاف ہے؛ اگرچہ مفسر حنفی ہیں اور ان کا مقصد فقہ حنفی کی ترجمانی بھی ہے، مگر وہ مخالف دلائل کو چھپاتے نہیں بلکہ کھلے دل سے پیش کر کے علمی انداز میں ان کا جائزہ لیتے ہیں؛ البتہ بعض مقامات پر حنفی مسلک کی تائید میں ان کا رجحان واضح محسوس ہوتا ہے، جس کی طرف ناقدین نے بھی اشارہ کیا ہے۔ تیسری خصوصیت لغوی و اصولی پختگی ہے؛ آپ حکم کے استنباط سے پہلے لفظ کی دلالت کو اصول کے ترازو میں تولتے ہیں۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتاب صرف فقہی مسائل تک محدود نہیں؛ اس میں کلامی مباحث بھی آئے ہیں اور مفسر نے جابجا معتزلہ کے ان دلائل کا بھی رد کیا ہے جو وہ آیات سے پیش کرتے تھے، کیونکہ ابتدائی عمر میں ان کا میلان کسی قدر اعتزال کی طرف رہا تھا اور بعد میں وہ اس سے رجوع کر چکے تھے۔ پانچویں خصوصیت اس کا اثری پہلو ہے؛ اس میں سلف کے اقوال اور تفسیری روایات بھی بڑی مقدار میں محفوظ ہو گئی ہیں، اس لیے یہ کتاب تفسیر بالماثور کے محققین کے لیے بھی قیمتی ماخذ ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ امام ابو بکر جصاص چوتھی صدی ہجری کے ان نادر علماء میں سے ہیں جنہوں نے فقہ، اصول اور تفسیر تینوں میدانوں میں مرجع کتب چھوڑیں۔ ان کی احکام القرآن فقہی تفسیر کا اولین عظیم شاہکار ہے جس میں مسئلے کی ترتیب، دلائل کی مضبوطی اور اصول کی پختگی اپنے عروج پر ہے۔ اس کتاب نے آیات الاحکام کی تفسیر کو ایک مستقل فن کی صورت دی اور بعد میں آنے والے تمام فقہی مفسرین کے لیے نمونہ فراہم کیا۔ تاریخِ تفسیر کے طالب علم کے لیے اس کتاب کا مطالعہ اس لیے ناگزیر ہے کہ اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سے احکام کشید کرنے کا باقاعدہ علمی طریقہ کار کس طرح وجود میں آیا۔

سوال نمبر :5 المحرر الوجیز اور احکام القرآن از ابن العربی المالکی :تعارف اور مفسرین کا منہج 20) نمبر(

سوال نمبر5 ۔ المحرر الوجیز اور احکام القرآن از ابن العربی المالکی کا تعارف اور ان میں مفسرین کا منہج تحریر کریں۔

تعارف

پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں اندلس) مسلم اسپین (تفسیر کے میدان میں دو ایسے درخشندہ نام سامنے آئے جن کی کتب آج بھی مدارس و جامعات میں پڑھائی جاتی ہیں :ایک ابن عطیہ اندلسی کی المحرر الوجیز اور دوسرا قاضی ابو بکر ابن العربی مالکی کی احکام القرآن۔ پہلی کتاب روایت و درایت کے امتزاج کی عمدہ مثال ہے اور دوسری مالکی فقہ کی نمائندہ آیات الاحکام کی تفسیر ہے۔ اس جواب میں دونوں مفسرین کا تعارف، ان کی کتب کا تعارف اور ان کے تفسیری منہج کا تقابلی بیان پیش کیا جائے گا۔

ابن عطیہ اور المحرر الوجیز کا تعارف

المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز کے مصنف قاضی عبدالحق بن غالب بن عطیہ اندلسی غرناطی ہیں۔ آپ481 ھ میں غرناطہ میں پیدا ہوئے، جلیل القدر علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، فقہ مالکی کے ماہر اور غرناطہ کے قاضی بھی رہے۔ آپ کی وفات541 ھ میں ہوئی۔ ان کی تفسیر کا نام ہی اس کے مزاج کو ظاہر کرتا ہے :محرر یعنی مدقق و مرتب،

اور وجیز یعنی مختصر۔ مصنف کا مقصد یہ تھا کہ اسلاف کی مفصل تفسیروں، خصوصاً تفسیر طبری، کے ذخیرے کو تحقیق و تنقید کے ساتھ مختصر و جامع صورت میں پیش کر دیا جائے تاکہ طالب علم کے لیے سمندر ایک معتبر خلاصے میں سما جائے۔ یہ تفسیر متعدد جلدوں میں شائع ہو چکی ہے اور اہل اندلس و مغرب میں اسے جو قبولیت ملی وہ کم ہی کسی تفسیر کے حصے میں آئی۔

ابن عطیہ کا منہجِ تفسیر

ابن عطیہ کا منہج روایت و درایت کا حسین امتزاج ہے۔ وہ آیت کے تحت پہلے سلف کے اقوال کو اختصار کے ساتھ جمع کرتے ہیں، پھر ان اقوال کا تنقیدی جائزہ لے کر راجح قول کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لغت و نحو کی بحث ان کی تفسیر کی جان ہے؛ وہ الفاظ کے معانی کی تحقیق، اعراب کے اختلاف اور اس سے پیدا ہونے والے معنوی فرق کو نہایت عمدگی سے بیان کرتے ہیں۔ قراءتوں کا ذکر بھی ان کے منہج کا اہم جز ہے اور وہ قراءت کے فقہی و معنوی اثرات واضح کرتے ہیں۔ اسرائیلیات کے باب میں ان کا رویہ نہایت سخت و محتاط ہے؛ وہ بے اصل قصے نقل کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اور جہاں ذکر آئے وہاں اس کی کمزوری کی طرف تنبیہ کر دیتے ہیں۔ کلامی مسائل میں وہ اہل سنت کے عقائد کی ترجمانی کرتے ہیں اور صفات کے باب میں تاویل کی طرف بھی ان کا رجحان ملتا ہے۔ یہی جامعیت اس کا سبب ہے کہ بعد کے مفسرین، خصوصاً قرطبی اور ابو حیان، نے المحرر الوجیز کو اپنا اساسی ماخذ بنایا۔

ابن العربی اور ان کی احکام القرآن کا تعارف

احکام القرآن کے مصنف قاضی ابو بکر محمد بن عبداللہ بن محمد ابن العربی المعافری الاشبیلی ہیں۔ آپ468 ھ میں اشبیلیہ)سیویل (میں پیدا ہوئے۔ علمی سفر میں آپ مشرق کی طرف نکلے، بغداد میں امام غزالی سے ملاقات و استفادہ کیا، شام و حجاز کا سفر کیا اور علوم کی تکمیل کے بعد وطن واپس آ کر اشبیلیہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ آپ مالکی فقہ کے امام، مایہ ناز ادیب اور کثیر التصانیف عالم تھے؛ العواصم من القواصم اور عارضۃ الاحوذی آپ کی مشہور کتب ہیں۔ آپ کی وفات 543ھ میں ہوئی۔ ان کی احکام القرآن آیات الاحکام کی تفسیر پر لکھی گئی مالکی مکتب کی نمائندہ ترین کتاب ہے، جس میں مصنف نے صرف انہی آیات کو لیا ہے جن سے شرعی احکام نکلتے ہیں اور ان کا فقہی مطالعہ پیش کیا ہے۔

ابن العربی کا منہجِ تفسیر

ابن العربی کا منہج بالکل فقہی و مسلکی نظام پر چلتا ہے۔ وہ آیت پیش کرنے کے بعد اس کے تحت مسائل کو مسألہ اولیٰ، مسألہ ثانیہ کے انداز میں نمبروار بیان کرتے ہیں۔ ہر مسئلے میں پہلے لغوی تحقیق کرتے ہیں، پھر فقہاء کے مذاہب ذکر کرتے ہیں، ادلہ پیش کرتے ہیں اور بالآخر دلیل کی قوت کی بنیاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ مالکی ہیں اور مالکی مسلک کی ترجمانی ان کی کتاب کا بنیادی مقصد ہے، لیکن ان کا انداز علمی دلیل پر کھڑا ہے اور وہ مخالفین کا نام لے کر ان کے دلائل کا جواب دیتے ہیں۔ بعض مقامات پر ان کا لہجہ سخت اختیار کر لیتا ہے، خصوصاً جہاں وہ مخالف مکاتب یا فرقوں پر تنقید کرتے ہیں۔ ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے آیات سے مستنبط مسائل میں ادب و لغت کی لطیف بحثیں بھی شامل کی ہیں، جس سے کتاب میں فقہ کے ساتھ ادب کی چاشنی بھی آ گئی ہے۔ جصاص کی احکام القرآن سے ان کی کتاب کا موازنہ کیا جائے تو جصاص زیادہ اصولی و استدلالی ہیں جبکہ ابن العربی نسبتاً ادیبانہ جوش و خطابت کے حامل ہیں؛ دونوں اپنے اپنے فقہی مکتب کے ترجمان ہیں۔

دونوں مفسرین کا تقابلی جائزہ

دونوں کتب کا موازنہ کیا جائے تو کئی مشترکات و فروق سامنے آتے ہیں۔ دونوں اندلسی ہیں اور فقہ مالکی کے ماحول کی پیداوار ہیں، مگر دائرہ کار میں فرق ہے :المحرر الوجیز پورے قرآن کی تفسیر ہے جبکہ ابن العربی کی کتاب صرف آیات الاحکام تک محدود ہے۔ ابن عطیہ کا مزاج محققانہ اختصار اور تنقیدی توازن ہے؛ وہ اقوال جمع کر کے ان میں فیصلہ کرتے ہیں، جبکہ ابن العربی کا مزاج فقہی استنباط و ترجیح ہے؛ وہ آیت کو مسئلہ سازی کی بنیاد بناتے ہیں۔ دونوں نے لغت کو بنیادی اہمیت دی، دونوں نے اسرائیلیات سے اجتناب کی روش اپنائی اور دونوں کا اثر بعد کے مغربی مفسرین پر گہرا پڑا؛ قرطبی کی جامع تفسیر درحقیقت ان دونوں کے امتزاج ہی کا نام ہے۔

نتیجہ

حاصل یہ ہے کہ المحرر الوجیز اور احکام القرآن اندلس کی تفسیری روایت کے دو جوہر ہیں۔ اولیٰ نے روایت و درایت کو متوازن اختصار میں ڈھال کر خلاصہ نویسی کا معیار قائم کیا اور دوسری نے آیات الاحکام کی فقہی تفسیر میں مالکی

مکتب کو وہ نمائندہ کتاب دی جو آج تک مرجع ہے۔ تاریخِ تفسیر کا یہ باب اس سبق پر روشن دلیل ہے کہ ہر خطے نے اپنے علمی مزاج کے مطابق قرآن کی خدمت کی اور اندلس کا مزاج لغوی تحقیق، فقہی پختگی اور تنقیدی اختصار تھا۔

USMAN NOTES
www.usmannotes.com